قیامت سر پر آ آ کر ٹل جاتی ہے یہ تذبذب کی کیفیت سخت اذیت ناک ہے۔ قیامت کو اگر ٹوٹنا ہی ہے تو ٹوٹ کیوں نہیں پڑتی۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ مجرم کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا اور جلاد کہیں کہ ہم حقہ پی کر آتے ہیں۔ پھر تجھے پھانسی لگائیں گے۔ یہ پورا محلہ پھانسی کے تختہ پر کھڑا ہے۔ پھانسی کا پھندا سر پر لٹک رہا ہے' گلے میں نہیں آتا۔ لوگ اسے غنیمت سمجھتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ پھانسی تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ پھانسی لگنے کا احساس تکلیف دہ ہوتا ہے

۱۰ ستمبر

پورے محلہ میں ایک سراسیمگی اور بدحواسی کی کیفیت طاری ہے۔ ہر شخص ڈرا ہوا ہے پریشان دماغ خوفناک سے خوفناک تصویر بناتے ہیں اور پھر اس سے مطمئن نہ ہو کر اسے مٹا ڈالتے ہیں۔ وہ کچھ زیادہ خوفناک تصویر بنانا چاہتے ہیں۔

ہر شخص اس فکر میں ہے کہ یہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائے۔ مگر یہاں سے نکل کون سکتا ہے۔ ہم ایک قلعہ میں محصور ہیں' ایسا قلعہ جس کی ہر دیوار بودی ہے۔

خوف و ہراس اس کی کیفیت ہر چہرے پر نظر آتی ہے۔ مگر شاید یہ خوف کی انتہا نہیں ہے۔ خوف کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ آدمی بے خوف ہو جاتا ہے۔ مجھے خوف ہر جگہ نظر آتا ہے۔ خوف کہ انتہا کہیں نظر نہیں آتی۔

۱۱ ستمبر

آج میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نہیں تھی۔ ہاں اس کے چہرے پر ایک خوفناک ارادے کی جھلک تھی۔ جسے دیکھ کر میں ایک مبہم خوف سے کانپ اٹھا۔ اپنے سامنے والے پنواڑی کی دوکان پر میں نے اس شخص کو دیکھا۔ وہ بہت دیر تک گم سم بیٹھا بیڑی پیتا رہا۔ اس کی نگاہیں خلا میں کسی چیز کو گھور رہی تھیں۔ ان نگاہوں میں ایک ایسی خوفناک کیفیت تھی کہ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ وحشت ہوتی تھی۔ پھر وہ ایکا ایکی پنواڑی سے مخاطب ہوا۔ ''پیلوان یو حملہ کیوں نئیں ہوتا؟'' پنواڑی نے نہ جانے کیا جواب دیا۔ اس نے اتنی آہستہ سے جواب دیا کہ میں سن نہ سکا میں نے بس یہ دیکھا کہ اس شخص نے اس جواب سے کوئی اثر نہیں لیا اور پھر اسی طرح خلا میں گھورنے لگا۔ بیڑی ختم کر چکنے کے بعد یہ شخص چپ چاپ اٹھا اور سامنے والی گلی میں مڑ گیا۔ اس کی چال ڈھال میں کچھ ایسی بے جگری کی کیفیت تھی جسے میں محسوس تو بہت شدت سے کر رہا ہوں مگر میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔

اس شخص کا پنواڑی نے نام بھی لیا تھا۔ شیر خاں' شیرا' شیرو نہ جانے کیا نام لیا تھا۔ بہر حال شیر پر کچھ نام ہے۔ مجھے دھیان پڑتا ہے

کہ یہ نام میں نے کہیں سنا ہے۔ یہ شکل بھی مجھے دیکھی بھالی سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ میں اتنے شہروں میں گھوما پھرا ہوں اور اتنے لوگوں کو میں نے دیکھا بھالا ہے کہ اب کسی شکل میرے ذہن میں واضح نہیں رہی ہے۔ دھندلی شکلوں کا ایک جلوس ہے جو میرے تصور میں چکر کاٹتا رہتا ہے۔ اس مختصر سی آوارہ زندگی میں میں نے بھی کس کس قماش اور کس کس رنگ کا آدمی دیکھا ہے۔

۱۲ ستمبر

تذبذب کے لمحات طویل ہوتے چلے جا رہے ہیں اس تشنج کی کیفیت سے مجھے ہنگامہ زیادہ پسند ہے۔ ساری دلی میں ہنگامہ برپا ہے۔ ہنگامہ برپا نہیں ہوتا تو یہاں برپا نہیں ہوتا۔ اب تو یہ کیفیت ناقابل برداشت ہو چلی ہے۔ میرے ذہن کی رگیں ٹوٹی جا رہی ہیں۔ بس یوں جی چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل جاؤں اور کسی ایسی سڑک پر پہنچوں جہاں ہر طرف خون ہو لاشیں ہوں اور چیخ پکار ہو۔ آخر میں پھانسی کے تختے پر کب تک کھڑا رہوں کیوں نہ میں خود ہی پھندے کو کھینچ کر گلے میں پھنسالوں۔

۱۳ ستمبر

آج کوئی نئی تاریخ نہیں ہے۔ وہی کل کی تاریخ ادھ موئی حالت میں رینگ رہی ہے بل کھا رہی ہے اور اگر واقعی آج کوئی نئی تاریخ ہے تو میں اسے کل کی تاریخ سے تمیز نہیں کر سکتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آج دن ہی نہیں نکلا۔ لہذا نئی تاریخ کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ رات جو کیفیت تھی وہ بھی جا رہی ہے اس کیفیت کو میں کیسے بیان کروں۔ بھلا اتنی شدید کیفیتیں الفاظ میں کیسے بیان ہو سکتی ہیں۔ زبان تو کام چلاؤ چیز ہے۔ ایسی شدید کیفیتیں ظاہری کب ہوتی ہیں جو ان کے اظہار کی ضرورت پیش آئے۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہنگامہ اور شور کا ایک سیلاب ہے' جو فضا میں بلند ہوتا چلا جا رہا ہے اور جو پوری دلی کو اپنی رو میں بہا کر لے جائے گا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوا کہ فضا میں ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ مگر یہ سناٹا اس شور سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔

فضا کی کیفیت اب بھی وہی ہے جو رات تھی۔ بس اتنا فرق ہے کہ رات آگ کے شعلوں نے فضا کو روشن رکھا تھا اور اب سورج کی ملگجی روشنی دیواروں اور میدانوں پر پڑ رہی ہے۔

۱۴ ستمبر

معلوم نہیں آج کی تاریخ کلنڈر میں کس طرح لکھی ہوئی ہے۔ مگر مجھے وہ چمگادڑ کی طرح الٹی لٹکی نظر آتی ہے۔ شاید آج وقت ہی الٹا لٹک گیا ہے۔ میں رات بھر جاگا اور دن بھر سویا۔ دن ابر آلود تھا۔ رات جلتے ہوئے مکانوں نے فضا میں ہر طرف روشنی کر رکھی تھی

جس شخص کو میں نے دیکھا وہ ہونق بنا ہوا تھا پریشان اور سراسیمہ تھا۔ مگر محلہ کے اکثر کتوں کو میں نے دیکھا کہ وہ اطمینان سے چلتے پھرتے ہیں' محلہ سے باہر جاتے ہیں اور گھوم پھر کر واپس آتے ہیں اور بیچ سڑک پہ آرام کرنے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے دنیا کا نظام الٹا ہو گیا ہے۔

؟ ستمبر

مجھے یاد نہیں آتا کہ آج کیا ہے یا تو آج کوئی تاریخ ہے ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو وہ اتنی زبردست تاریخ ہے کہ میں اسے بیان کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اس وقت میں جہاں ہوں لوگ اسے پرانا قلعہ بتاتے ہیں۔ میں یہاں کب آیا اور کیسے آیا اس کا مجھے مطلق پتہ نہیں ہے۔ میرا ذہن اس وقت کچھ ٹھیک کام نہیں کرتا۔ مجھے کوئی بات یاد نہیں ہے میرے حافظہ میں بس کچھ انمل بے جوڑ تصویریں منڈلا رہی ہیں۔ میں ان میں ربط پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ سب دھندلی اور غیر واضح تصویریں ہیں۔ روشن تصویر تو بس اس شخص کی ہے جس کا دماغ خراب ہو گیا تھا اور جو مسلسل دو دن تک مشین گن چلاتا رہا۔ یہ وہی شخص ہے شیر خاں' شیرا' شیرو۔ جو بھی اس کا نام ہو۔ وہ تو نام سے ماورا ایک شخصیت تھا۔ اس کا دماغ خراب ہو جاتا۔ یہاں پرانے قلعہ میں ہر طرف آدمی ہی آدمی دکھائی دیتا ہے۔ یہ عجب کرشمہ ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی دماغ خراب نہیں ہوا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنی بصارت پر شبہ گزرنے لگتا ہے۔ کسی پاس سے گزرتے ہوئے آدمی کو میں چھو کر دیکھتا ہوں۔ وہ واقعی آدمی ہی ہوتا ہے اور پھر بھی اس کا دماغ چلا ہوا نہیں ہوتا۔ لیکن اس شخص کا دماغ چل گیا تھا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ وہ سامنے والے مکان کی چھت پر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کے چہرے کے خطوط سخت پڑ گئے تھے۔ اس کے پورے جسم پر ایک خشونت طاری تھی۔ وہ بالکل گم سم ہو گیا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے یا غلط کر رہا ہے۔ صحیح اور غلط کے متعلق شاید خود اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ شاید وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ کر رہا تھا۔ باقی لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ ان کے حواس معطل ہو گئے تھے۔ محلہ کے چاروں طرف ایک شور برپا تھا۔ مسلسل شور اور مسلسل آگ۔ مکانوں میں آگ لگ رہی تھی۔ گولیاں دھوں دھاں چل رہی تھیں۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں بھاگ رہے تھے اور وہ شخص اسی طرح گم سم وحشت زدہ کیفیت میں کھڑا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ آگ کے شعلوں' دھواں' گولیوں اور چیخ و پکار کی اس رستاخیز میں وہ شخص کہاں گیا۔ وہ گولی کا نشانہ بن گیا یا جل کر مر گیا یا زمین میں سما گیا' یہ مجھے خبر نہیں۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ اب زندہ نہیں ہے۔

۱۸ ستمبر

میرے حواس اب تک اعتدال پر نہیں آئے ہیں۔ اس وقت میرا سر گھوم رہا ہے میری آنکھوں سے گرمی نکل رہی ہے نہ جانے میں کب سے نہیں سویا۔ جب بھی میری ذرا آنکھ لگتی ہے شیر خاں کا گم سم وحشت زدہ چہرہ میرے سامنے آ جاتا ہے۔ تڑاتڑ گولیاں چلنے لگتی ہیں اور دھوئیں شعلوں چیخوں اور نعروں کا ایک مخلوط طوفان امنڈنے لگتا ہے۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے یہ گم سم چہرہ میرے تصور میں بس گیا ہے' میرے ذہن پر مسلط ہو گیا ہے۔

۱۹ ستمبر

شیر خاں کون تھا؟ وہ زندہ ہے یا مر گیا؟ یہ سوالات آج دن بھر میرے ذہن میں چکر کاٹتے رہے ہیں۔ میں نے آج محلہ کے کئی آدمیوں سے اس کے متعلق پوچھا۔ وہ اتنا بتاتے ہیں کہ وہ شخص محلہ میں نیا آیا تھا۔ اس کا نام شیر خاں نہیں شیرو تھا۔ سب کہتے ہیں کہ وہ مر گیا۔ کیسے مرا' یہ کسی کو پتہ نہیں۔ مجھے یہ نام بھی سنا ہوا سا معلوم دیتا ہے اور یہ چہرہ بھی دیکھا بھالا سا لگتا ہے مگر میں نے اسے آخر کہاں دیکھا تھا۔ شاید میں نے اسے کہیں نہ دیکھا ہو۔ یہ محض میرا خیال ہو۔ ممکن ہے شیرو خود کوئی شخص نہ ہو۔ محض ایک خیال ہو' ایک تصور ہو۔ وہ تصور جو اپنی قوم کی بربادی کے ہر موقعہ پر اپنی ایک جھلک دکھاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ وہ تصور جو کبھی ٹیپو کے غفار کا بھیس بدلتا ہے اور کبھی بہادر شاہ ظفر کے کالے خاں گولنداز کے پیکر میں ظاہر ہوتا ہے۔

شیرو کے خوفناک تیور' اس کا گم سم چہرہ بار بار میری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ پورا منظر اپنی شکل بدلنے لگتا ہے وہ چھت لال قلعہ کی فصیل بن جاتی ہے اور شیرو مجھے کالے خاں گولنداز نظر آنے لگتا ہے۔ پھر کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ غفار ہے جو ایک ایسے قلعہ کی فصیل پر کھڑا ہے جس کے اندر کوئی ٹیپو نہیں ہے۔

کبھی کبھی تو میرے دل میں یہ خواہش کروٹ لینے لگتی ہے کہ اس المیہ کا کالے خاں گولنداز اس شخص کی بجائے میں ہوتا۔

۲۰ ستمبر

پرانے قلعہ میں پناہ گزینوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ محلے اجڑ رہے ہیں اور لوگ یہاں آ رہے ہیں۔ مختلف محلوں سے لوگ سمٹ کر پرانے قلعہ میں آتے ہیں۔ پرانے قلعہ سے اسٹیشن پہنچتے ہیں۔ اسپیشل بھرتی ہے اور پاکستان روانہ ہو جاتی ہے۔ گاڑیوں پر حملوں کی خبریں روز پہنچتی ہیں اور پھر بھی لوگوں کا ذوق وشوق کم نہیں ہوتا۔ دلی والے دلی چھوڑ کر یوں بھاگ رہے ہیں جیسے بیل رسہ تڑا کر بھاگتا ہے۔

۲۱ ستمبر

دمشق میں قحط پڑ رہا ہے مگر یاروں نے عشق کو فراموش نہیں کیا ہے۔ بلکہ شاید قحط کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار بھی تیز ہوگئی ہے جو بھی نل پہ پانی لینے گیا وہ پیمبر ہو کر پلٹا جو لڑکی کسی دوسرے خیمے کی طرف نکل گئی وہ ایک چوٹ مول لے کر واپس آئی۔ پرانے قلعہ میں دن بھر نکاح ہوتے ہیں۔ دولہا دلہن خود ہی راضی ہو جاتے ہیں۔ قاضی غریب تو مفت میں بدنام ہو رہا ہے۔ خانماں برباد پناہ گزینوں کے ہاتھ یہ اچھا مشغلہ آیا ہے۔ بیٹھے سے بیگار بھلی کا مضمون ہو رہا ہے۔

۲۲ ستمبر

بال آخر رخصت کی گھڑی آ پہنچی۔ اس عجیب و غریب شہر سے آج میں رخصت ہو رہا ہوں۔ یہاں میں آیا بھی عجب انداز سے اور جا بھی رہا ہوں عجب انداز سے۔ میں نے مسلمانوں کے بہت سے شہر دیکھے' بہت سی بستیوں کی سیر کی۔ مگر اس بستی کا سفر سب سے انوکھا رہا۔ اس شہر کے در و دیوار جن سے کل تک وحشت برستی تھی۔ آج چپ چاپ حسرت کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ یہ لال قلعہ' یہ قطب مینار' یہ جامع مسجد' یہ مسلمانوں کی تاریخ کے گنگ نغمے۔ یہ پرسوز منجمد مرثیے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ یہ پوری بستی نگاہوں سے چھپ جائے گی' تاریکی میں ڈوب جائے گی اور میں اپنے نئے وطن کی طرف جا رہا ہوں گا۔

شہر سے جو سیاہ سایہ دار سڑک اسٹیشن کو جاتی ہے اسے دیکھ کر آج کچھ ایسا گمان گزرتا تھا کہ کوئی بڑا میلہ ڈھل رہا ہے۔ اس سڑک نے گنگا کے میلے اکثر ڈھلتے دیکھے تھے۔ لوگ منہ اندھیرے اٹھتے اور اکوں تانگوں میں بیٹھ بیٹھ کر اسٹیشن کی راہ لیتے۔ جنہیں سواری نہ ملتی وہ پیدل ہی چل پڑتے اور ہنستے بولتے منزل پر پہنچ جاتے۔ اس سڑک سے ہٹ کر جو ایک کچی سڑک ریل کی پٹری کو پار کرتی ہوئی چلی گئی ہے۔ اس پر بیل گاڑیوں کا ایسا تانتا بندھتا تھا کہ ٹوٹنے میں نہ آتا۔ دیہاتیوں کی ایک ٹولی آواز میں آواز ملا کر گیت گانا شروع کر دیتی اور پھر خاموش ہو جاتی۔ چند لمحوں تک خاموشی رہتی اور پھر دوسری ٹولی گیت شروع کر دیتی۔ گیتوں کا یہ سلسلہ رات رات بھر اور دن دن بھر جاری رہتا۔ دن کے ہنگامے تو ان گیتوں کو کہاں ابھرنے دیتے تھے مگر مہاوٹوں کی راتوں میں وہ اپنی پوری کیفیت بن جگاتے مگر یہ خاموش سہما ہوا میلہ اس ڈر سے کانپ رہا تھا کہ کہیں رات اس کے قدموں کی چاپ نہ سن لے۔ معلوم نہیں رات کو کونسی گھڑی میں یہ میلہ ڈھلنا شروع ہوا تھا لیکن جب اجالا ہوا تو سڑک پر دور تک اکوں' تانگوں' رکشاؤں کی ایک لین ڈوری نظر آئی۔ ایک بڑا ہجوم ایسا بھی تھا جس نے پیدل ہی اسٹیشن پہنچنے کی ٹھانی تھی۔ خاک آلود چہرے' پھٹی پھٹی آنکھیں' چٹکے ہوئے بال' مضمحل جسم' جسم جوتن ہو چکے تھے۔ جسم جو خود بخود حرکت کر رہے تھے۔ حسن پور کی فضا نے ایسا میلہ ڈھلتے ہوئے کبھی کاہے کو دیکھا ہوگا۔

اسٹیشن آدمیوں سے پٹا پڑا تھا۔ چاروں طرف سامان کے ارنگ کے ارنگ لگے ہوئے تھے۔ بکنگ آفس کے سامنے ایک میلہ

لگا تھا۔ ٹکٹ کی کھڑکی پہ وہ دھکا پیل تھی کہ خدا کی پناہ۔ پہرے کے سپاہی کی جب ساری گالیاں بے اثر ثابت ہوئیں تو انسپکٹر پولیس ہنٹر لے کر باہر نکلا۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ مگر صرف تھوڑی دیر کے لیے۔ چند منٹ بعد پھر آدمی پہ آدمی گرنے لگا۔ البتہ وہ سفید داڑھی والے بزرگ جن کے رخسار پہ ہنٹر پڑا تھا پھر نظر نہیں آئے۔ ہجوم میں ہر قماش اور ہر حلیہ کا آدمی موجود تھا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو دھیرے سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اپنے وجود کو بچا لانے کو ایک کارنامہ قرار دے رہے تھے ایسے لوگ بھی تھے جو گھروں میں جھاڑو دے کر آئے تھے اور ہاتھ مل رہے تھے کہ وہ اپنے بھرے گھر چھوڑ آئے۔ بعض لوگوں کو اپنا وجود بھی بار گزر رہا تھا اور بعض لوگ بال بچوں کے ساتھ ساتھ کبوتروں سے بھری ہوئی کابکیں اور ٹوپوں میں بند مرغیاں بھی ہمراہ لائے تھے۔ بعض قلندر مزاج سارے گھر بار پہ لات مار کبوتروں کی کابک سر پر رکھ اسٹیشن آ پہنچتے تھے۔ بلو غریب پیٹ سے تھی۔ اپنا آپا سنبھالتی یا سامان باندھتی۔ اس کے ہاتھ میں بس ایک پوٹلی تھی۔ البتہ حمید ڈاکیہ نے ضروری چیزوں سے ٹرنک بھر لیا تھا۔ نوابن صرف ایک گٹھڑی بغل میں مار لائی تھی۔ ہاتھ میں طوطے کا پنجرا تھا۔ حق صاحب چار ٹرنک' ایک سوٹ کیس اور ایک بستر ہمراہ لا سکے۔ انہیں اس موقعہ پر اہلیہ مرحوم رہ رہ کر یاد آئیں۔ وہ ہوتیں تو ہو تھوڑا بہت سامان اور ساتھ لے آتے۔ نمبردار نے بیٹی اور نقدی اور زیور تینوں چیزوں کو بذریعہ ہوائی جہاز لاہور بھیجنے کا تہیہ کیا تھا۔ اس سے بیٹی کی عصمت کی حفاظت کے سوا اور کچھ مقصود نہ تھا۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ دلی کے فساد کی وجہ سے ہوائی جہاز پر پہنچنے کا رستہ ہی بند ہو گیا۔ اور اب نمبردارنی کو گھر کے دوسرے سامان سے پہلے نقدی اور گہنے پاتے کے صندوق اور فرحت کی فکر کرنی پڑی۔ انہوں نے یہ عقلمندی کی تھی کہ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے دوسرے سامان کے ساتھ ساتھ چارپائیوں کو کھول کر ان کے پائے پٹیاں بھی ایک جگہ باندھ لی تھیں۔ مگر بکنگ آفس والا سخت متعصب نکلا۔ اس نے پائے پٹیوں کو بک کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ افسری بوجی کے برابر کھڑی تھی۔ اس کی وہ تمکنت بدستور قائم تھی۔ ہاں اس کی شربتی آنکھیں اب کچھ اور زیادہ گمبھیر اور کچھ اور زیادہ افسردہ نظر آتی تھیں۔ بوجی کب تک کھڑی رہتیں صندوق پر بیٹھ گئیں۔ انہوں سے گھر سے کبھی کاہے کو قدم نکالا تھا۔ زندگی میں ایک مرتبہ ضرور انہوں نے ایک عزیز کی موت میں شرکت کی غرض سے سفر کی نیت باندھی تھی۔ لیکن ابھی اسٹیشن نہ پہنچنے پائی تھیں کہ نیل کھنٹھ رستہ کاٹ گیا۔ فوراً اکہ واپس کروایا اور اس کے بعد پھر کبھی سفر کا ارادہ نہیں کیا۔ لیکن آج وہ ہر قسم کے شگون اور بدشگونی کو بھول کر بیٹے کے ساتھ گھر سے نکل پڑی تھیں اور بیٹا خود یہ نہیں جانتا تھا کہ آخر وہ گھر سے کیوں نکل پڑا ہے۔ نمبردار صاحب اور حق صاحب نے تو فساد ہوتے ہی ہجرت کی تجویز پیش کر دی تھی۔ مگر وہ ایسا اڑا کہ ان کی بات چلنے ہی نہ پائی' لیکن آج ان کی بات خود بخود چل گئی تھی اور وہ اسٹیشن پر حیران و پریشان کھڑا تھا۔ وہ شخص جس نے اپنی ایک عمر مسلمانوں کے زوال کے اسباب سمجھنے اور ان کی

توجیہات کرنے میں صرف کی تھی۔ آج حسن پور کے اسٹیشن پر مجسم سوال بنا کھڑا تھا اس کی سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ سبطین حیران تھا اور کالے خاں اور علن اور رفیا بھی حیران تھے۔ بوجی بھی حیران تھیں اور اگر حسن پور کے در و دیوار میں حیران ہونے کی صلاحیت ہوتی تو وہ بھی ضرور حیران ہوتے کہ حسن پور کے یہ ہیرو اوپر کوٹ کے یہ مڈھ آخر کیوں جا رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ حسن پور کے در و دیوار حیران نہ ہوئے ہوں مگر علن کی دوکان کی خستہ دیواریں ضرور حیران ہوئی ہوں گی۔ سب اپنا اپنا سامان لے کر نکلے تھے۔ کوئی تھوڑا سا سامان لے کر نکلا تھا۔ کوئی بہت سا سامان لے کر نکلا تھا۔ لیکن علن کونسا سامان لے کر نکلتا۔ اس کی دوکان میں رکھا ہی کیا تھا۔ یہی سڑی بسی گڑ دہانیاں اور ریوڑیاں اور ٹوٹی پھوٹی چلمیں۔ اس کی دولت دوکان کی چیزیں نہیں خود دوکان تھی دوکان کو وہ کیونکر لاتا۔ اور اب دوکان باقی کہاں تھی۔ وہ تو شاہ بہرام کی سبز پری۔ نکلی شہر کے بادشاہ نے سبز پری کی سرائے کے گرد حلقہ ڈال دیا اور سبز پری لوٹ پوٹ کر کبوتری بنی اور اڑ گئی۔ سبز پری اڑ گئی کھو گئی اور شاہ بہرام سر دھنتا رہ گیا۔ شاہ بہرام کی قسمت میں آوارگی لکھی تھی۔ شاہ بہرام آوارہ ہو گیا۔

ٹکٹ کی خریداری جوئے شیر لانے سے کچھ کم نہ تھی۔ اسباب بک کرانا خود ایک مسئلہ تھا۔ پھر گیٹ پر ہو بھیڑ تھی کہ اس کو دیکھ کر اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ غرض پلیٹ فارم تک پہنچنا ہفت خواں کا معرکہ بن گیا لیکن طے کرنے والوں نے ہفتخواں کی ساری منزلیں طے کیں اور جب اسپیشل اسٹیشن پر پہنچی تو اس میں آدمی ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔ دراصل وہ تو دلی کے اسٹیشن پہ ہی پر ہو چکی تھی۔ اب تو اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی لیکن جہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ وہاں حسن پور کا ایک قافلہ کا قافلہ اور سما گیا۔ آدمی جب پھیلتا ہے تو وسیع و عریض زمین بھی تنگ ہونے لگتی ہے اور جب سکڑتا ہے تو تل بن جاتا ہے اس لدی پھندی گاڑی میں اور مسافر کیسے سمائے۔ بات تعجب خیز سہی مگر ہے واقعہ ہی۔ جو شخص جس ڈبے میں گھس سکا گھس گیا اور گھستے ہی ڈبے کا محافظ بن گیا اس قسم کے خود ساختہ محافظ ہر ڈبے کے دروازے پہ ڈٹے کھڑے تھے۔ پلیٹ فارم پہ ٹامک ٹوئیاں مارنے والوں کی یہ متفقہ رائے تھی کہ یہ لوگ اسلامی احساس سے عاری ہیں۔ ان ٹامک ٹوئیاں مارنے والوں میں سے جو شخص خوشامد درآمد سے یا دھینگا مشتی سے اندر پہنچ گیا۔ یک لخت ان کی صف میں شامل ہو گیا۔ ہر طرف نفسا نفسی پڑی تھی۔ دوسروں کی کسے خبر ہوتی۔ لوگوں کو خود اپنا ہوش نہ تھا۔ ہر شخص گاڑی میں داخل ہونے کے لیے باؤلا ہو رہا تھا۔ جو اندر داخل ہو گیا۔ اسے جنت کا پروانہ مل گیا جو رہ گیا اس کے لیے دنیا اندھیر ہو گئی۔ ایسے میں سبطین کی کیا چلتی اور بوجی غریب تو پس کے آٹا ہو جاتیں۔ مگر قسمت کی کارسازی دیکھئے کہ ایک ڈبے میں فیاض خاں بیٹھا نظر آ گیا۔ اس نے سبطین ہی کو نہیں اوپر کوٹ کے اور بہت سے لوگوں کو بھی اپنے ڈبے میں گھسا لیا۔ بوجی گاڑی میں بھلا کب سوار ہوئی

تھیں اور اس پہ یہ دھکا پیل اور کشتم کشتا۔ پاؤں رکھتی کہیں تھیں۔ اور پڑتا کہیں تھا۔ اندر داخل ہوئیں تو ایک دلی والی نے دھکا دیا۔

''اوئی میرے پاؤں کا کچلا ہو گیا۔ اے بی آپ کو رتو ند آتی ہے کیا؟''

بوجی نے فوراً معذرت کی۔ ''بی بی معاف کر دو۔ میں نے دیکھا نہیں تھا۔''

دلی والی چپ تو ہو گئی مگر جب جگہ دینے کا سوال آیا تو پھر بھڑک اٹھی۔ ''اے واہ تم بڑی آئیں کہیں کی۔ میں خود پھنسی بیٹھی ہوں۔ دلی سے بس یونہی چلی آ رہی ہوں۔ نگوڑا پاؤں بھی تو ایک جگہ رکھے رکھے سن ہو گیا۔''

جیسے تیسے کر کے بوجی کو بیٹھنے کی جگہ ملی۔ اتنے میں نوابن نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ''اے ہئے میرے طوطے کا پنجرا رہ گیا۔ اے بھیا کوئی اٹھا دو'' اور جب کسی نے اس شور پہ دھیان نہ دیا تو اس نے پینترا بدلا۔ ''اے توبہ توبہ۔ کمبخت کیسے آدمی ہیں۔ ایسی بھی آپا دھاپی کیا۔ پنجرا اٹھانے سے نگوڑے ہاتھ تو نہ ٹوٹ جاویں گے۔''

آخر کالے خاں کی غیرت نے جوش مارا۔ کودتا پھاندتا وہ کھڑکی سے باہر پہنچا اور پنجرا لا کر نوابن کے حوالے کیا۔ بوجی کو اب تک تو تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ لیکن بیٹھتے ہی انہوں نے ہوشمندی دکھائی اور اپنے اسباب کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سبطین کو دیکھ کر ان کا سانس میں سانس آیا۔ گلشن تو خیر برابر ہی بستر پہ ڈٹی بیٹھی تھی۔ آس پاس کے مختلف چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ یکا یک چونکیں۔

''اے سبطین۔ رفیا کہاں گیا۔''

سبطین نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ بھی ذرا گھبرایا۔ ''ارے بھئی رفیا کدھر رہ گیا۔''

لیکن علن نے فوراً اسے اطمینان دلا دیا۔ ''اجی وے ابھی گیا ہے۔ بیڑی لینے۔ آتا ہوگا۔''

سبطین خاموش ہو گیا۔ رفیا بہت دیر تک واپس نہ آیا۔ گارڈ نے جب آخری سیٹی دی اس وقت وہ لپکا ہوا آیا۔ کھڑکی کا دروازہ بند تھا۔ کالے خاں نے بڑی مشکل سے اس کا ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچا۔ گاڑی کو ایک جھٹکا سا لگا اور ایک دھیمے شور کے ساتھ ساتھ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ مایوس اور افسردہ چہروں کی ایک پوری قطار سامنے سے گزر رہی تھی اس وقت گاڑی کے اندر والوں کو یہ احساس ہوا کہ کتنے لوگ ایسے تھے۔ جنہیں گاڑی میں جگہ نہ مل سکی۔

رفیا کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے ایک لمبا سا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میاں میں تو وے ہر ڈبہ میں دیکھیا یا۔ وے کہیں بھی نئیں ہے۔''

کالے خاں کا افسردہ چہرہ اور زیادہ افسردہ ہو گیا۔

علن تھوڑی دیر تک بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ''وے کسی اور اسپیشل سے چل دیا۔''

سبطین کے کان کھڑے ہوئے۔ ''کون چل دیا؟''

رفیا نے جواب دیا۔ ''اجی کوئی بھی نئیں۔ دے تھا سپو میاں۔ وے تھا نئیں شیرو۔'' اس کا لہجہ اور دھیما ہو گیا۔ ''وے دلی چلا گیا تھا۔''

فیاض خاں گم متھان بنا بیٹھا تھا۔ خود سبطین کی یہ ہمت نہیں پڑی تھی کہ اس سے بات کرے۔ ''شیرو'' کے لفظ پہ وہ ایک ساتھ چونکا۔

''کون'' کالے خاں گولنداز؟.... وہ...''

کالے خاں نے فوراً اسے ٹوکا۔ ''نئیں میاں۔ میں نئیں۔ دے تھا شیرو۔''

''شیرو؟..... شیر و مر گیا۔''

کالے خاں کے چہرے پہ مردنی چھا گئی۔ رفیا کا منہ اور لٹک گیا۔ سبطین حیرت سے کبھی کالے خاں' رفیا اور علن کی صورتوں کو دیکھتا اور پھر فیاض خاں کے چہرے کے سخت ہوتے ہوئے خطوط کو تکنے لگتا۔ اتنے لوگوں کو سنجیدہ دیکھ کر دوسرے ڈبے والے خود بخود سنجیدہ ہو گئے۔ سارے ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔ علن ٹکٹکی باندھے فیاض خاں کی صورت کو دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا ''اچھا؟ شیر و مر گیا''

''ہاں شرو مر گیا.... مرا گیا۔'' فیاض خاں کے لہجہ میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا مگر اس کا چہرہ اور سخت پڑ گیا تھا۔ اس پہ ایک مبہم تاریک سی پرچھائیں کانپ رہی تھی۔

ڈبے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ بہت دور سے کسی خواب کی دنیا سے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ یہ آواز تیز ہوتی گئی۔ اسٹیشن پیچھے رہ گیا تھا۔ سامنے حسن پور کی عمارتیں ایک ہجوم کی شکل میں نظر آ رہی تھیں۔ اوپر کوٹ کی بہت سی عمارتیں ان میں صاف پہچانی جا سکتی تھیں۔ بعض عمارتیں جل پھنک گئی تھیں۔ بعض پہ صرف کالونس بچی ہوئی تھی۔ بعض کی سفیدی جوں کی توں قائم تھی۔ ڈپٹی صاحب کی بلند حویلی کے کنگروں نے اسفہامیہ علامتوں کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ سبطین ٹکٹکی باندھے دیر تک اس منظر کو دیکھتا رہا۔ گاڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ حسن پور کے مکانات کے نقوش مدھم پڑتے جا رہے تھے۔ سامنے ایک روئی کے کارخانے کا ستون نظر آتا۔ پھر شفاخانے کی عمارت دکھائی دی۔ پھر خالی میدان اکا دکا درخت سامنے آئے۔ حسن پور نے مدھم ہوتے ہوتے ایک میلی دھجی

کی شکل اختیار کی۔ پھر وہ ایک بدرنگ نقطہ بن گیا۔ پھر یہ نقطہ آہستہ آہستہ فاصلہ کی دوری میں تحلیل ہوگیا بوجی کی پلکوں پر دیر سے ایک قطرہ کانپ رہا تھا۔ انہوں نے دوپٹے کے آنچل سے آہستہ سے آنکھ کو پونچھا۔ پھر برقعہ کی نقاب گری اور بوجی نے سر اندر کرلیا۔

''مگر اس کا شوہر کہاں ہے؟'' فیاض خاں نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

''فساد میں مارا گیا۔''

''بہت خوب''

سبطین جل کر بولا۔ ''اس کے مرنے کی بڑی خوشی ہوئی تمہیں۔''

''ایک شخص کا مرنا بھی کوئی مرنا ہے کہ اس کی خوشی کی جائے۔ میں دلی میں بہت بڑا جشن دیکھ کر آ رہا ہوں۔'' فیاض خاں نے طنز کا جواب طنز سے دیا۔

سبطین گرما کر بولا۔ ''تو پھر چراغاں کیا ہوتا۔''

''اس کا انتظام تھا۔''

سبطین چپ ہوگیا۔ فیاض خاں کا چہرہ پھر سخت پڑتا چلا گیا اور ایک مبہم سی سیاہ پرچھائیں پھر اس کے چہرے پہ کانپنے لگی۔

بوجی اور دلی والی کے باہمی اختلافات ختم ہو چکے تھے۔ سر سے جوڑ کر وہ کچھ اس طرح باتیں کر رہی تھیں گویا برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ دلی والی کہہ رہی تھی۔ ''اے بوا جی۔ وہ مردار میلے سر سے حضرت کے روضے پہ پہنچ گئی۔ میں نے جو اسے دیکھا تو بندی تو تھرا گئی۔ بس یہ سمجھ لو کہ اگلی جمعرات بھی نہ پکڑی لڑائی شروع ہوگئی۔''

برابر میں ایک اور دلی والی بیٹھی تھی۔ گفتگو میں ٹانگ اڑاتے ہوئے بولی۔ ''اجی میں نے تو خالی کے مہینے ہی میں کہہ دیا تھا کہ کچھ ہو کے رہے گا۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ دلی میں دھوم کی برات نکل رہی ہے۔ باجا گاجا' انار' گولے' مہتابیاں چھٹتے چھٹتے پھلواری لٹنے لگی۔ میں صبح کو اٹھی تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اے بی' وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ایک دن چین کا نہ آیا اور وہ لٹس پڑی کہ دلی کا اوجڑ ہوگیا۔''

بوجی کہنے لگیں۔ ''اری بی بی' میں نے تو جس دن دمدار ستارہ دیکھا تھا۔ اسی دن کہہ دیا تھا کہ غدر پڑے گا۔ نمبردارنی تمہیں تو یاد ہے نا؟''

نمبردارنی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اے مجھے کیوں یاد نہ ہوتا۔ اس پہ میں نے یہ کہا تھا کہ بھئی آج کل تارے بہت ٹوٹ رہے

ہیں۔"

غدر کا لفظ دلی والی کے لیے بہت خیال انگیز ثابت ہوا۔ بولی۔ "میری اماں حضرت فرماتی تھیں کہ غدر میں جب لوگوں کی توپیں دغیں تھیں تو ایک گولہ ہماری انگنائی میں آ کے گرا تھا۔ مگر یہ کلموئے تو گوروں سے بھی سوا ہاتھ بڑھ گئے۔ اے بی۔ گوک پہ گولیاں یوں آ آ کے گریں جیسے چنے بھن رہے ہوں۔"

نمبردارنی بحث کو ایک دوسرے رخ پر موڑنا چاہا۔ "اری بی بی۔ بڑی تباہی آئی۔ روپیہ پیسہ، مال اسباب سب پانی کے ریلے میں بہہ گیا۔"

بوجی بات کاٹتے ہوئے بولیں۔ "اے نگوڑے پیسے کا کیا ہے۔ خاک سی چیز۔ وہ تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ مگر میں تو یہ کہوں ہوں کہ آبرو موتی کیسی آب ایک دفعہ جا کر پھر نہیں آتی۔ بس میرا تو نہیں ہولوں میں دم نکلتا تھا کہ کہیں آبرو"

"اے بی آبرو وابرو کہاں رہی۔" بوجی کی بات دلی والی نے کاٹی۔ "آپ پرانے قلعہ میں ہوتیں تو دیکھ دیکھ کر عش کرنے لگتیں۔ آج کل کی لڑکیاں ہیں آفت کا پرکالہ ہیں اس افراتفری میں توائے اوائے اوسان خطا ہوتے تھے۔ مگر ان کا تو اور دیدہ پھٹ گیا۔ مرداریں کھل کھیلیں۔" اس کی آواز نے سرگوشی کی شکل اختیار کر لی۔ "اے بی آپ کو کیا بتاؤں۔ اپنی ہی بات ہے۔ یہ گھٹنا کھولوں ہوں تو وہ گھٹنا کھلے ہے۔ وہ کھٹنا کھولوں ہوں تو یہ گھٹنا کھلے ہے۔ پرانے قلعہ میں روز یہی رہتا تھا۔ جس کی بات نکل گئی۔ اس نے بیاہ رچا لیا۔ خاک ایسی شادی پہ۔ نہ مہندی نہ سندور، نہ ابٹنا۔"

نمبردارنی غصہ سے بولیں۔ "نگوڑی شرم میں بھی اٹھ گئیں۔ وہ جو کسی نے کہا تھا کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ گائے گوبر کھائے گی اور بیٹی برما نگے گی تو وہ یہی زمانہ آ گیا ہے۔"

"ہاں بی بی۔" بوجی ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولیں۔ "بڑا خراب زمانہ آیا ہے۔ یہ دنیا اب رہنے کی جگہ تھوڑائی ہے۔ کتوں چاٹی ہنڈیا ہے"

بوجی کے فقرے نے اپنا اثر دکھایا۔ فضا میں افسردگی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ بوجی پہ غنودگی طاری ہو گئی۔ دلی والی نے بھی اونگھنا شروع کر دیا۔ گاڑی بدستور چھک چھک کرتی چلی جا رہی تھی۔ اسٹیشن آئے اور نکل نکل گئے۔ گاڑی جس اسٹیشن سے گزری۔ پلیٹ فارم خالی نظر آیا اور گیٹ کے جنگلوں پہ ایک ٹھٹھہ دکھائی دیا۔ اسٹیشن سے ہٹ کر لوگ جا بجا قطار باندھے غور سے یہ تماشا دیکھتے نظر آئے۔ حسن پروالوں کی بارات نکل رہی تھی۔ جس نے اس بارات کو دیکھا ٹھٹھک کر رہ گیا۔ سہارن پور کے اسٹیشن سے گزرتے

ہوئے گاڑی کی رفتار دھیمی ہوئی اسٹیشن گزر گیا۔ رفتار پھر تیز ہوگئی۔ اب شام ہو چلی تھی۔ جس تیزی سے گاڑی چل رہی تھی۔ تقریباً اسی تیزی سے دونوں وقت ملے اور جدا ہو گئے۔ یکا یک کوئی بولا۔ ''اب مشرقی پنجاب شروع ہونے والا ہے۔'' یہ فقرہ بہت آہستگی سے اور بہت ڈرتے ڈرتے کہا گیا تھا۔ لیکن یہ عجب بات ہے کہ اکثر صورتوں میں ڈھول پیٹے جائیں اور گھروں کی چھتوں پہ کھڑے ہو ہو کے خطاب کیا جائے۔ پھر بھی کوئی نہیں سنتا اور بعض فقرے ہونٹوں سے نکل نہیں پاتے اور لوگوں کے کانوں میں پہنچ جاتے ہیں ہونٹوں سے نکلی کوٹھوں چڑھی والی مثل خواہ مخواہ تو پیدا ہوئی نہیں تھی۔ ایک شخص نے ہونٹ پھر پھرائے۔ سب کے دل دھڑکنے لگے۔ ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔ خاموشی نے سرگوشیاں کو جنم دیا۔ گفتگو کا تنوع ختم ہو گیا۔ سارے موضوعات پس منظر میں جا پڑے۔ اب ہر شخص کے لب پر مشرقی پنجاب کا ذکر تھا۔ پھر کسی نے آہستہ سے کہا ''لو بھئی! یوپی کی سرحد ختم ہوگئی۔'' واقعہ یوں ہے کہ یہ فقرہ کہا نہیں گیا تھا۔ صرف محسوس کیا گیا تھا اور ایک کونے سے دوسرے کونے تک سناٹا چھا گیا گاڑی چلتی رہی' پہیوں کی گھڑ گھڑ کا شور ہوتا رہا اور سناٹا طاری رہا۔ پھر دلی والی کا بچہ رو پڑا۔ اس نے کھٹ سے کرتا اٹھایا اور اپنی چھاتی منہ میں دے دی مگر چھاتی چوڑنے کی آواز بعد تک آتی رہی۔ نوابن میں جرات گفتار شاید اسی آواز نے پیدا کی تھی۔ اس نے نمبردارنی کے کان میں کھسر پھسر کرنی شروع کر دی۔ ان کی کھسر پھسر سے بوجی کا حوصلہ بندھا اور وہ دلی والی کے کانوں میں باتیں کرنے لگی۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور حوصلہ سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک خربوزے کو دیکھ کر دوسرے خربوزے نے جو رنگ پکڑا تھا وہ باقی خربوزوں میں خود بخود منتقل ہوتا چلا گیا۔ سرگوشیاں پہلے تو اس قدر مدھم تھیں کہ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ خاموشی سانس لے رہی ہے۔ پھر خاموشی زور زور سے سانس لینے لگی۔ پھر سانس میں خراٹوں کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہوئی۔ کانا پھوسی کرتے کرتے کسی کی ذرا زور سے آواز نکل گئی۔ دوسری ٹولی میں کسی بزرگ نے خود اعتمادی کے مظاہرے کی غرض سے خود ہی کوئی فقرہ بلند آواز سے کہہ دیا۔ یوں سرگوشیوں کو آواز مل گئی۔ لیکن اس بڑھتے ہوئے عمل میں یکا یک پھر پچر لگ گئی گاڑی کی رفتار دھیمی ہوتی گئی' دھیمی ہوتی گئی اور آخر گاڑک رک کر کھڑی ہوگئی۔ ''حملہ ہوگا۔'' یہ فقرہ وجدان کی زبان سے ادا ہوا اور دلوں میں اترتا چلا گیا پھر خاموشی چھا گئی۔ ڈبے میں اندھیرا تھا۔ اس لیے یہ تو پتہ نہ چل سکا کہ لوگوں کے چہروں کی کیا کیفیت ہے۔ لیکن اتنا تو صاف محسوس ہوتا تھا کہ سب کے دل دھڑ دھڑ کر رہے ہیں۔ دور دور تک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گاڑی ساکت و جامد کھڑی تھی۔ گاڑی کا ہر مسافر اپنی جگہ جما کا جما رہ گیا تھا۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس پوری گاڑی کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ اندھیرے میں کسی صورت کیا دکھائی دیتی۔ بس بہت سے ساکت و جامد سایوں کا ایک ہجوم دکھائی پڑتا تھا۔ دفعتاً دیا سلائی گھسنے کی آواز اور آواز سے روشنی پیدا ہوئی۔

''یہ کون بے وقوف ہے؟'' حق صاحب نے دبی آواز سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''یہ میں بے وقوف ہوں۔ فرمایئے کیا فرماتے ہیں آپ۔'' یہ آواز فیاض خاں کی تھی۔ حق صاحب کو سانپ سونگھ گیا۔

پچھلے کونے سے کوئی جلے تن بولا۔ ''اے صاحب! سگریٹ بھایئے روشنی کی سیدھ میں گولی آئے گی۔''

فیاض خاں نے ''اے صاحب'' کا ٹکڑا طنزاً دہراتے ہوئے کہا۔ ''اے صاحب' آپ کو میری تبھی سے ایسی کیا دلچسپی ہے۔ میں پوپلا ہو جاؤں گا۔ ہو جانے دیجئے۔ آپ تو پاکستان اپنی تبھی سمیت پہنچیں گے۔''

''پاکستان میں لوہے کے چنے چابنے پڑے تو خاں صاحب کیا کریں گے۔'' یہ دبی آواز غالباً رفیا کی تھی۔ اس کے برابر علن بیٹھا تھا۔ اسی کے کان میں یہ بات کہی گئی ہوگی۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ فیاض خاں بدستور سگریٹ پیتا رہا۔

''توبہ توبہ بڑی گھٹس ہے۔ نگوڑی گاڑی''

یہ آواز شاید دلی والی کی تھی جسے نمبردار صاحب نے بیچ میں کاٹ دیا۔ ''کون ہے یہ خاموش رہو۔''

سکوت کی کیفیت پھر طاری ہوگئی لمحے طویل سے طویل تر ہوتے چلے گئے پھر وقت تھم گیا۔ وقت اور ریل گاڑی کی دیکھا دیکھی ہوا بھی رک گئی تھی۔ ڈبے کے اندر امس سے لوگوں کا برا حال تھا۔ لیکن کسی کو ہلنے کی ہمت نہیں تھی۔ ایکا ایکی کسی پیچھے کے ڈبے سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور کسی نے بے ساختہ کہا۔ ''حملہ ہو گیا۔'' اس فقرے پہ ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی۔ فیاض خاں نے بلند آواز سے کہا۔ ''کیوں صاحب یہ کس بزرگ نے حملہ کرایا ہے؟'' خاموشی پھر عود کر آئی۔ فضا میں ایک سناٹے کی کیفیت طاری تھی۔ گاڑی جمی کھڑی تھی۔ ہر مسافت بت بنا بیٹھا تھا۔ لوگوں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے تھا۔ آخر گاڑی کو اچانک ایک جھٹکا لگا۔ گاڑی چل پڑی حملہ نہیں ہوا تھا۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پرچھائیوں کو حرکت ہوئی۔ خاموشی ٹوٹ گئی۔

گاڑی کے ساتھ ساتھ ہوا بھی چلی۔ گرمی اور گھٹس کم ہوئی تو گرمی اور گھٹس کا احساس پیدا ہوا۔ اس کا اظہار سب سے پہلے نوابن نے کیا۔ ''اے توبہ! میرا تو گرمی کے مارے اچار پڑ گیا۔''

فیاض خاں نے بہت آہستہ سے سبطین سے پوچھا۔ ''وہ چٹنی کی ہنڈیا کدھر ہے؟''

''اس بھلائے میں مت رہنا۔ چٹ کر جائے گی اور ڈکار نہیں لے گی۔''

''تم اسے چٹوری سمجھا کرو۔ اپنے لیے تو وہ چاٹ ہے۔''

سبطین حسب دستور پھر خاموش ہو گیا۔

گاڑی کی تیز رفتاری میں اب یکسانیت پیدا ہو چلی تھی۔ یوں باتیں بھی بڑی تیز رفتاری سے شروع ہوئی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کا بھی زور گھٹنے لگا۔ گلشن نے بستر پہ بیٹھے بیٹھے اطمینان سے خراٹے لینے شروع کر دیئے تھے۔ بوجی کا سر دیوار پہ ٹک گیا تھا۔ لیکن انہیں آرام سے سونا نصیب نہ ہوا۔ دلی والی عین کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ سر کہاں ٹکاتی۔ جب اسے اونگھ آتی تھی تو اس کا سر ڈھلک کر بوجی کے شانے پہ ٹک جاتا تھا اور بوجی پھر چونک پڑتی تھیں یہی حرکت نوابن نمبردارنی کے ساتھ کر رہی تھی۔ لیکن نمبردارنی اس قسم کے ہلکے پھلکے رخنوں کو کب خاطر میں لاتی تھیں۔ بلو نے پاؤں بھاری ہونے کی وجہ سے اتنی رعایت تو حاصل کر لی تھی کہ اسے صندوق کی بجائے نشست پر جگہ مل گئی تھی۔ مگر وہ اتنی جگہ کہاں تھی کہ وہ اپنے گھڑے سے پیٹ سمیت آنکھ لگا سکتی۔ ایک تو اندھیرا اور پھر بے ڈھنگی نقل و حرکت بیٹھنے والے کہیں سے کہیں پہنچ گئے گلشن دراصل بوجی کی ٹانگوں اور دلی والی کی ٹانگوں کے بیچ میں جا ٹکی۔ نمبردارنی نے ذرا پیشاپ خانے تک جانے کی خطا کی تھی۔ واپس جو آئیں تو نوابن نے کچھ اس طرح سے زاویہ بدل لیا تھا کہ انہیں صندوق پر جگہ تو مل گئی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس سے کھسک کر بستر پا جا رہیں اور ان کا سر بلو کی ٹانگوں کی بجائے فرحت کی ٹانگوں پہ جا ٹکا۔ جو غلطی نمبردارنی سے ہوئی تھی۔ وہ افسری سے بھی سرزد ہوئی واپسی پر اس نے بوجی کے قریب بیٹھنے کی کوشش کی تھی مگر زاویہ بگڑا سو بگڑا یہ اور بات ہے کہ افسری نے بگڑے ہوئے زاویے کو کچھ زیادہ بگڑا ہوا نہیں سمجھا۔

گاڑی رک رک کر چلی اور چل چل کر رکی۔ چلتے چلتے دفعتہ "جنگل

میں کھڑی ہو جاتی لوگ چونک پڑتے۔ پہرے کے سپاہی اترتے جنگل میں فلیش لائٹ پھینکتے۔ ایک دو ہوائی فائر کرتے اور گاڑی پھر چلنی شروع ہو جاتی۔ پھر باتیں ہونے لگتیں اور لوگ پھر اونگھنے لگتے۔ فیاض خاں اور سبطین بدستور جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھ پل بھر کے لیے نہیں لگی تھی۔ سبطین نے یہ عقلمندی کی تھی کہ رواروی میں کیپٹن کے دو تین ڈبیاں جیب میں بھر لایا تھا۔ ان ڈبیوں نے بڑا کام دیا۔ ان کے بل پہ دونوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی وہ کیوں جاگ رہے تھے؟ ڈر کی وجہ سے؟ مگر علی الاعلان ڈر نے والے یا باتیں کر رہے تھے یا خراٹے لے رہے تھے۔ سبطین کوئی بات کہتا فیاض خاں اس کا جواب دیتا۔ مختصر جملوں میں مختصر سی گفتگو ہوئی اور دونوں خاموشی سے سگریٹ پینے لگتے۔ ان کی آوازیں خشک تھیں۔ ایسے موقعے بہت کم آئے جب ان کی آواز میں واقعی افسردگی کا رنگ پیدا ہوا۔ ان موقعوں پر اکثر یوں ہوا کہ جب فیاض خاں کے لہجہ میں افسردگی پیدا ہوئی۔ تو سبطین نے طنز کیا اور

جب سبطین کی آواز میں رقت پیدا ہوئی تو فیاض خاں نے قہقہہ لگایا۔ بسا اوقات آدمی کا چہرہ دل کا غماز بن جایا کرتا ہے۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ ڈبے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ان کے چہرے پہ جو کیفیت بھی ہو وہ اس پردے میں چھپی ہوئی تھی۔ اس رات اس اندھیرے نے بہتوں کے پردے رکھے اور بہتوں کے دلوں کے راز ظاہر کر دیئے۔ اندھیرے میں بلا کیا معلوم دیتا۔ نہ فیاض خاں اور سبطین کے چہرے نظر آتے تھے اور نہ افسری کا بے نقاب چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مختلف نازک موقعوں پر اس کے چہرے پہ کیا کیفیت گزری۔ اس کا علم بھی عالم الغیب ہی کو ہے کہ اس نے ارادتاً ایسا کیا تھا یا واقعی غنودگی کے عالم میں اس کا سر فیاض خاں کے شانے پہ جا ٹکا تھا۔ فیاض خاں نے پہلے تو کسی مخملی سی شے کو اپنے بدن سے لگتے ہوئے محسوس کیا اور پھر ایک معطر سر ڈھلک کر اس کے شانے پہ ٹک گیا۔ فیاض خاں نے بڑے سکون کا مظاہرہ کیا۔ چند منٹ تک وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے دھیرے سے اس کا سر اٹھا کر الگ کیا اور چپکے سے اس کے کان میں کہا۔ گھر سے تکیہ لے کر نہیں چلی تھیں؟'' یہ بات بھی پردہ تاریکی ہی میں رہی کہ افسری پر اس فقرے کا کیا اثر ہوا۔ البتہ جب فیاض خاں نے سگریٹ کا زور سے کش لیا تو اس کی روشنی میں اتنا نظر آیا کہ افسری کی بھنویں تنی ہوئی تھیں۔ غالباً چہرہ بھی سرخ پڑ گیا تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ محض سگریٹ کی سرخ لو کا کرشمہ ہو۔ گاڑی چلتے چلتے پھر رک گئی اور بیچ جنگل میں رکی۔ حق صاحب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کیا ہوا بھئی؟''

''حملہ ہونے والا ہے۔'' سبطین نے بڑے سکون سے حق صاحب کو اطلاع دی۔ اے حق صاحب کو بنانے میں یوں بھی مزا آتا تھا۔

فیاض خاں نے برجستہ کہا۔ ''مجھ پہ تو حملہ ہو چکا۔''

حق صاحب دونوں کو سمجھتے تھے۔ سمجھ گئے کہ خواہ مخواہ بکارتے ہیں۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ پھر چل نکلی۔ حق صاحب نے اپنا وقت گنوانا مناسب نہ سمجھا۔ جس پھرتی سے جاگے تھے۔ اسی پھرتی سے پھر سو گئے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی اور جاگ پڑنے والوں پر غنودگی کا جادو اسی رفتار سے پھر چڑھنے لگا۔ فیاض خاں نے ڈبیا سے نئی سگریٹ نکال کر جلائی اور ذرا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

گاڑی کی رفتار پھر دھیمی ہو چلی تھی۔ رات کی سیاہی ڈھل چکی تھی۔ لیکن ایک دھند کی کیفیت ابھی باقی تھی۔ چاروں طرف فضا میں ایک بدرنگ دھند کی کیفیت طاری تھی۔ میدان اور کھیت دور تک اجاڑ پڑے تھے۔ جا بجا مویشیوں کے پورے پورے ڈھانچے اور خالی کھوپڑیاں پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ انسانی لاشیں بھی جا بجا نظر آئیں۔ میدان اور کھیتوں سے پرے ایک چھوٹی سی اجڑی ہوئی بستی اپنے مکینوں کا ماتم کر رہی تھی۔ بہت سے کچے مکانات تو بالکل ڈھیر ہو چکے تھے۔ کسی کسی کی ایک آدھ دیوار ضرور کھڑی رہ گئی

تھی۔ پکا مکان ممکن ہے اسی بستی میں ایک ہی ہو۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ دو دیواریں خالی کڑیوں کو دوش پہ سنبھالے کھڑی رہ گئی تھی۔ باقی سارا مال مسالہ نے ملبہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک اجلا سا سفید مینار یہ بتانے کو باقی رہ گیا تھا کہ یہ بستی مسجد سے محروم نہ تھی گاڑی کی رفتار اور آہستہ ہوگئی۔ رفتار آہستہ ہونے کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی کئی سفید کھمبے گاڑی کے برابر آئے اور نکل گئے۔ رفیا چونک کر بولا۔ ''ابے علن۔ ابے او کالے خاں۔ ابے اٹھو بے نا امرتسر آ گیا۔''

کالے خاں اور علن دونوں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ''امرتسر آ گیا؟''

کئی طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ ''کیوں بھئی امرتسر ہے؟''

ایک طرف سے آواز آئی۔ ''امرتسر ابھی کہاں بھائی۔ یہ تو مجھے جالندھر لگے ہے۔''

اس پہ کسی نے ٹکڑا لگایا۔ ''میاں گھاس کھا گئے ہو۔ جالندھر امرتسر کے بعد آتا ہے۔''

''جالندھر تو رات گزر بھی لیا۔'' یہ انکشاف حق صاحب کی طرف سے کیا گیا جو رات بھر سوئے تھے۔

''بھئی انبالہ آ رہا ہے۔'' نمبردار صاحب نے قطعی انداز میں کہا۔

لیکن جب پلیٹ فارم کے آغاز پر لدھیانہ کی تختی نظر پڑی۔ تو ساری قیاس آرائیاں ختم ہوگئیں اور حسب دستور ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک گئی۔ پلیٹ فارم پہ جا بجا شرنارتھی ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ بعض شرنارتھیوں نے اپنے خیموں کی حدیں اپنے بکس اور ٹرنک چن کر قائم کی تھیں۔ بعض شرنارتھیوں نے محض چارپائی کو کھڑا کر لینا ہی کافی سمجھا تھا۔ ایک سکھ شرنارتھی نے ایک بنچ پر بستر جما کر اپنا ٹھکانا کیا تھا۔ سامنے دوسرے پلیٹ فارم پہ شرنارتھیوں کی ایک گاڑی لدی پھندی کھڑی تھی۔ جس کے ڈبوں سے زیادہ چھت پہ ہجوم تھا۔ چند ایک بگڑے دل انجن پہ جا کے ٹک گئے تھے۔ ایک نوجوان سکھ شرنارتھی نے دو ڈبوں کے بیچ میں بڑے آرام سے زنجیروں میں اپنا گھونسلہ بنا لیا تھا۔ مہاجروں کے اس غول کو وہ اس بری طرح تک رہا تھا۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں کھا جائے گا۔ مگر ایک اس پہ ہی کیا منحصر تھا۔ وحشت تو ہر آنکھ سے برس رہی تھی۔ پلیٹ فارم پہ گھومنے والے سکھوں نے کچھ اور ٹھسے کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیا تھا اور اپنی ننگی تلواروں کو کچھ اور زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے گاڑی کے اندر موت کا سناٹا طاری تھا۔ نمبردارنی نے صرف چٹکی کے ذریعہ فرحت کو ہدایت کی تھی کہ کمبخت اس وقت تو منہ ڈھک لے۔ نوجوان عورتوں نے تقریباً سب نے ہی اپنے منہ ڈھک لیے تھے۔ البتہ افسری نے اس سلسلے میں کوئی اہتمام ضروری نہ سمجھا۔ اس نے نہ تو نقاب یکسر اٹھائی اور نہ اسے بالکل گرایا ہی۔ کمبخت نوابن کے طوطے کو بھی اسی وقت بولنا رہ گیا تھا۔ اس نے بڑے سکون سے نغمہ

سرائی شروع کی۔ ''میاں مٹھو بنی جی بھیجو'' خطا طوطے نے کی اور لوگوں نے گھورنا شروع کیا نوابن کو۔ نوابن غریب نے اسے بہت چمکارا اور دبی آواز میں کہا۔ ''میاں مٹھو اس وقت چپ ہو جاؤ۔'' مگر جب وہ چپ نہ ہوا۔ اور نمبردانی نے اشاروں اور نگاہوں سے بڑھ کر دبی ہوئی آواز میں تنبیہہ کی تو نوابن نے غصہ میں آ کر پنجرے کو جھنجھوڑ مارا۔ طوطے نے کلکاریاں لگائیں۔ پر پھڑ پھڑائے اور پھر ایک تیلی سے چمٹ کر وہ حیرت سے اپنے اردگرد کے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اس کا مختصر سا جسم ایک کانپتی ہوئی سی شے بن کر رہ گیا تھا۔ دلی والی کی صندلی بلی نے بھی پر پرزے نکالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے گود میں اسے ایسا بھینچا کہ وہ غریب پھر سا اٹھا ہی نہ سکی۔ خاموشی بہت دیر تک طاری رہی۔ لیکن خاموشی کا سب سے کمزور پہلو یہی ہے کہ وہ بہت دیر تک طاری نہیں رہ سکتی۔ پہلے جسم حرکت میں آئے۔ پاس والوں سے پرے سرکنے کی دبی آوازوں میں التجائیں کی گئیں۔ پھر کھسر پھسر ہونے لگی۔ ہاں جب کوئی شرنارتھی گاڑی کے برابر سے گھورتا ہوا نکلتا تو سناٹا اچھا جاتا اس کے گزر جانے پہ پھر کھسر پھسر شروع ہو جاتی۔ حق صاحب بے شک بہت ڈرے ہوئے تھے لیکن یہ واقعہ ہے کہ سکھ اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کرنے کا حوصلہ سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا تھا۔ جب وہ ڈبے کے برابر سے اندر جھانکتا ہوا گزر رہا تھا تو حق صاحب نے پہلے تو ''سردار جی'' کے خطاب کے ساتھ بڑے محنت آمیز لہجہ میں سلام جھکایا۔ اس کے بعد وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔ لیکن سردار جی انہیں گھورتے ہوئے چلے گئے۔ اور حق صاحب نے اپنے ہونٹوں پہ جو مسکراہٹ پیدا کی تھی وہ ہونٹوں پہ اچھی طرح پھیلنے سے پہلے ہی مر گئی۔ فیاض خاں نے بہت گھور کر حق صاحب کو دیکھا اس کے چہرے پہ سرخی دوڑ گئی۔ اس نے بہت تیکھے انداز میں حق صاحب کو دیکھا اور بولا۔

''کیوں جی حق صاحب کیا کہہ رہے تھے اس سے۔''

حق صاحب خفیف ہو کر بولے۔ ''کچھ نہیں بھئی یہ پوچھتا تھا کہ گاڑی کب چلے گی؟''

''نیچے اتر کر پوچھ آیئے نا۔'' سبطین نے آہستہ سے کہا۔

حق صاحب اس فقرے کو شربت کا گھونٹ سمجھ کر پی گئے۔

خدا خدا کر کے گاڑی نے سرکنے کا نام لیا۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اطمینان نے بھوک کا احساس دلایا۔ ہنڈیاں، دیگچیاں، ڈبے، ناشتہ دان کھٹا کھٹ کھلنے لگے۔ جن لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد کو علن نے بھنے چنے اور گڑ اور بودار ریوڑیاں سپلائی کیں۔ علن نے یہ واقعی عقلمندی کی تھی کہ چلتے وقت اپنی دکان کے سارے چنے گڑ دہانیاں گولا چھوارے، ریوڑیاں اور الا بلا چادر میں باندھ لایا تھا۔ علن کی فیاضی سے بہتوں نے فائدہ اٹھایا۔ آخری کونے میں ایک صاحب نے اپنے لالوں

کا پنجر ابلند کرتے ہوئے کہا۔

''اے صاحب! ہمارے لال بھوک سے دم توڑ رہے ہیں۔ دو دانے چنے کے دے دو۔''

کالے خاں نے چنوں کی لپ بھری اور خود اس شخص کی گود میں ڈال کر آیا۔ فیاض خاں نے سبطین کے ناشتے میں حصہ بٹانے سے صاف انکار کر دیا۔ بوجی نے بہت برا مانا۔ مگر اس نے ایک نہ مانی۔ علن سے چنے لے لینے میں اس نے کوئی عذر نہیں سمجھا۔ مگر اس نے چار پانچ پھنکیوں میں ان کا صفایا کر دیا۔ کالے خاں نے اسے ایک گڑ دہانی بھی دی تھی۔ جسے وہ ایک وار میں چٹ کر گیا۔ اس کے بعد اس نے کالے خاں اور علن دونوں کی ساری پیشکشوں کو رد کر دیا اور سبطین کے لوٹے کی ٹوٹنی سے منہ لگا غٹ غٹ آدھا لوٹا پانی چڑھا گیا۔ دراصل بوجی افسری کو بھی تھوڑے سے ناشتہ سے نوازنا چاہتی تھیں۔ افسری اپنے چند ایک کپڑے اور کنگھی پٹی کا سامان تو ضرور ساتھ لے سکی تھی۔ لیکن کھانے پینے کے نام اس کے پاس دو چپاتیوں سے زیادہ کچھ نہ تھا اور وہ رات ہی ختم ہو گئی تھیں۔ لیکن حق صاحب نے بوجی کو زحمت کرنے سے روک دیا۔ انہوں نے دو چپاتیاں اور دو شامی کباب گلشن کی معرفت کھٹ سے اس کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ اس سے پہلے وہ کئی چھوٹی موٹی مہربانیاں افسری پہ اور بھی کر چکے تھے۔ شاید اسی لیے اس نے ان کا خوان قبول کر لینے۔ میں کچھ بہت زیادہ ہچر مچر نہیں کی۔ پانی کا گلاس بھی وہ اسے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن افسری نے عجلت برتی اور بوجی سے پانی لے لیا۔ اس پہ سبطین اور فیاضی دونوں نے کچھ اس انداز سے حق صاحب کو دیکھنا شروع کیا کہ وہ غریب بوکھلا گئے۔

رفیا نے چپکے سے علن کے کان میں کہا۔ ''بے علن یو وکیل تو فروپہ لٹو ہو گیا۔''

علن نے برجستہ جواب دیا۔ ''وے بھی پھرکنی ہے۔ اسے تگنی کا ناچ نچاوے گی۔''

گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پہ پہنچ کر پھر رک گئی۔ اب ٹیکا ٹیک دوپہری کا وقت تھا اور لوگوں کے پاس پانی ختم ہو چلا تھا۔ سامنے نل چل رہا تھا۔ لیکن کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اتر کر پانی لے آئے۔ فیاض خاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نوابن کا کنستر لیا اور نیچے اتر گیا۔ اسے دیکھ کر کالے خاں اور سبطین بھی نل پہ پہنچ گئے۔ جب انہوں نے مسلسل پانی لانا شروع کیا اور کوئی حادثہ رونما نہ ہوا تو دوسروں کی بھی ہمت بندھی اور پھر تو بالٹیوں' گھڑوں' کنستروں' لوٹوں' ڈونگوں اور گلاسوں کی ایک لین ڈوری لگ گئی ڈبے میں جتنی بے والی وارث عورتیں تھیں انہیں پانی فراہم کرنے کا فرض فیاض خاں اور کالے خاں نے انجام دیا۔ سبطین نے بھی یہ فرض انجام دینے کی نیت تو باندھی تھی لیکن غریب دھان پان سا آدمی' دو بالٹیوں کے بعد اس کا دم پھول گیا۔ خیر اس کی طرف سے رفیا یہ کام انجام دے رہا تھا۔ رفیا اور علن نے بہت سے موٹے مسٹنڈے مردوں کو بھی پانی لانے کی زحمت سے بچایا۔ جن میں حق صاحب اور نمبردار صاحب

کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فیاض خاں نے جن بے والی وارث عورتوں کو پانی لا کر دیا تھا۔ ان میں افسری شامل نہیں تھی۔ اسے نے اس کا لوٹا بھرنے کی پیشکش ضرور کی تھی۔ مگر افسری نے اس پیشکش کو بڑی رعونت سے ٹھکرا دیا۔ فیاض خاں نے اسی رعونت سے اپنی پیشکش واپس لے لی۔ البتہ جب فیاض خاں کے چلے جانے پر حق صاحب نے اپنی بالٹی میں سے اس کے لوٹے میں پانی بھرا۔ تو اس نے انہیں حقارت سے تو ضرور دیکھا مگر منع کرنے کا تکلف نہیں کیا۔

گاڑی پھر چل پڑی اور اپنی اسی پرانی چال سے چلی۔ جس بے ڈھنگے انداز میں رکتی تھی اسی بے ڈھنگے انداز میں چلتی تھی۔ جب آس بالکل ٹوٹ جاتی تھی تو گاڑی اچانک چل پڑتی تھی۔ جب رکنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تو یکا یک پہیے چرخ چوں کرتے اور گاڑی اڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ فضا ڈراؤنی۔ مناظر یکساں اور بے کیف اسٹیشنوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا۔ کہ برسوں سے ان میں جھاڑو نہیں دی گئی۔ کھیت اور میدان اجاڑ سنسان۔ جا بجا مویشیوں کے ڈھانچے اور اکا دکا انسانی لاشیں۔ جلی پھنکی بستیاں۔ مسمار مسجدیں۔ بربادی کے مناظر میں بھی کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ فیاض خاں اور سبطین ٹکٹکی باندھے ان مناظر کو اس یکسوئی سے دیکھ رہے تھے کہ شاید انہیں یہ احساس بھی نہ رہا تھا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کر یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ بہت دور میدان میں ایک ادھ مرے سانپ کی طرح بل کھاتا ایک طول طویل قافلہ رینگتا چل رہا تھا۔ گاڑی چلتی رہی چلتی رہی اور ٹھیک بیاس کے پل پر پہنچ کر رک گئی۔ قافلہ ریل کی لائن کو کاٹتا ہوا گزر رہا تھا۔ چھکڑوں اور بیل گاڑیوں کا ایک سلسلہ بہت دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ خاک آلود چہرے، خوف سے لرزتے ہوئے جسم، وحشت آلود آنکھیں ان کے سروں کے بڑے بڑے پگڑ اور چوڑے چکلے تہبند اور قد آور جسم بتا رہے تھے کہ یہ لوگ بھی ضرور بہادر ہوں گے۔ انہوں نے نہ معلوم کیسے کیسے معرکے مارے ہوں گے اور کیسے کیسے سورماؤں سے ٹکریں لی ہوں گی۔ مگر وقت کی ایک جنبش نے انہیں بزدل بنا دیا تھا اور وہ اپنے خون سے سینچی ہوئی زمینوں کو، اپنی آبائی بستیوں کو، یوں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ جیسے بھونچال میں لوگ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔ بھونچال واقعی آیا تھا۔ بھونچال خوں برساتا اور انگارے اگلتا آیا تھا اور لوگ اپنے گھروں اور اپنی جائدادوں کو، اپنی جمع جتھ اور اپنے ساز و سامان کو، اپنی آبرو کو، اپنی آن کو غرض سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ جو لوگ گھوڑے کو دوڑاتے ان میدانوں میں داخل ہوئے تھے۔ آج چھکڑوں اور گاڑیوں میں بیٹھ کر یہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ تاریخ میں تکرار ہی کا نہیں طنز کا پہلو بھی شامل ہے۔ گاڑیاں اور چھکڑے گزرتے چلے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے پیدل قافلہ تھا۔ بوڑھے، نوجوان، بوڑھی عورتیں، حاملہ عورتیں، بچیاں غرض ہر قسم کے لوگ تھے۔ نوجوان عورتیں بھی تھیں۔ مگر نسبتاً کم۔ ڈھائی گھنٹے میں خدا خدا کر کے یہ قافلہ ختم ہوا گاڑی نے سیٹی دی۔ اور چل نکلی۔

گاڑی چلتی رہی، رکتی رہی۔ رکتی رہی، چلتی رہی۔ دونوں وقت پھر تیزی سے ملے اور جدا ہو گئے۔ اجاڑ میدان اور جلی پھنکی بستیاں تاریکی میں روپوش ہو گئیں۔ رات گئے امرتسر اسٹیشن سے گاڑی تیزی سے گزری اور آگے بڑھ گئی۔ مگر جب آگے چل کر گھنے جنگل میں گاڑی رک گئی تو لوگوں کا کلیجہ پھر دھک سے رہ گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پہیوں کو پھر جنبش ہوئی اور گاڑی چل نکلی۔ اٹاری کے اسٹیشن پر پہنچ کر پاکستان کی امانت پاکستان کے سپاہیوں کے سپرد ہوئی۔ وہاں سے گاڑی ذرا بڑھی تھی کہ ان تمام لوگوں نے جو اب تک بہت دبکے دبکائے اور ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ پھریری لی۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ جذبات کی حرارت اظہار کے لیے نعروں کا سہارا ٹٹولنے لگی۔ پاکستان زندہ باد کے نعروں سے ہر ڈبہ اور ڈبے سے باہر کی فضا گونج اٹھی۔ حق صاحب نے کچھ اس انداز سے پھریری لی جیسے منہ پڑنے کے بعد مرغا اپنے گیلے پر جھاڑتا ہے گردن پھلاتا ہے اور پھر کگڑوں کو صدا بلند کرتا ہے۔ وہ اچانک کھڑے ہو گئے۔ جوش میں اور بہت سے لوگ بھی کھڑے ہو گئے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ چنانچہ پہلے تو حق صاحب کی کسی نے نہ سنی۔ لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے مجمع پہ قابو پا لیا۔ اب ان کی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔ ''بھائیو مسلمانو! پاکستان ہم نے اپنا خون دے کر حاصل کیا ہے۔ اور جب ہم اس پاک سرزمین پہ قدم رکھنے والے ہیں۔ ہم اپنے خالق سے یہ عہد کریں کہ ہم پاکستان کی حفاظت کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دیں گے۔ مسلمانو! پاکستان تم سے ایمان کی طاقت کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایثار و قربانی کا جذبہ طلب کرتا ہے۔ تم پاکستان کا مطالبہ پورا کرو غازیوں کی زندگی جیو اور شہیدوں کی موت مرو۔ یاد رکھو کہ ہمیں ایک مرتبہ اس طرف پھر پلٹنا ہے۔ ہم فوجیں لے کر پلٹیں گے اور لال قلعہ پہ پاکستانی جھنڈا لہرائیں گے۔''

اس آخری فقرے نے بڑا کام کیا۔ لوگوں نے بے تحاشا نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ فیاض خاں سبطین سے کہنے لگا۔ ''یار یہ تمہارا حق کیا کوئی بہروپیا ہے؟''

سبطین نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''نہیں مسلم لیگی ہے۔''

''تم کہاں کے رہنے والے ہو جی؟''

''امرتسر کا۔''

''امرتسر ختم کر کے آئے تھے یا پہلے ہی آ گئے تھے۔''

''جی کیا بتاؤں جی۔ جب امرتسر میں گولے چھٹنے لگے تب میں وہاں سے نکلا۔ سارا مال میرا غارت ہو گیا۔ جی کیا بتاؤں۔ امرتسر میں میرا بہت بڑا ہوٹل تھا۔ یہاں میں کابک میں بیٹھا ہوں اور پھر بھی الاٹمنٹ والے آ آ کے تنگ کرتے ہیں۔''